اکتوبر ۱۹۹۳ء کے انتخابات اور ہمارے مسائل

پاکستان کو اپنی مختصر سی تاریخ میں کئی بار سیاسی بحرانوں کا شکار بننا پڑا۔ ان میں سے ۱۹۷۱ء کا بحران ایک خوف ناک المیہ پر منتج ہوا اور نصف ملک وفاق سے الگ ہو کر بنگلہ دیش کے نام سے وجود میں آ گیا، خیال تھا کہ ہمارے ارباب اقتدار اس المیہ سے سبق لے کر اپنے سیاسی اور اجتماعی نظام کا جائزہ لیں گے اور گہری نظر سے اپنی ناکامیوں کا کھوج لگا کر پاکستان کو صحیح معنی میں ایک اخلاقی، جمہوری اور فلاحی ریاست بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن صد افسوس۔ ایسا نہ ہو سکا۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ سیاست اور اقتدار پر ان لوگوں کا قبضہ رہا جو جمہوریت کی اخلاقی اقدار پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ یا وہ اس قابل ہی نہ تھے کہ روح عصر یا فطرت کے تازیانہ عبرت کو سمجھنے کی کوشش کریں، یا ایک نئے اخلاقی اور جمہوری انسان کے روپ میں دوسرا جنم لے سکیں، چنانچہ ہم نے دیکھا کہ سیاست میں وہی آمرانہ مزاج، معیشت میں وہی ظالمانہ روش کام کر رہی ہے، جس کے ہاتھوں اخلاق، عدل و انصاف اور قانون کی برابر بے حرمتی ہوتی رہی اور ہماری اجتماعی زندگی، رشوت، سفارش اور لوٹ مار کی علامت بن کر رہ گئی۔ غرضیکہ اس المیے کے بعد بھی ہماری سیاسی زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی، جس پر ۱۹۷۱ء سے پہلے چل رہی تھی۔ چنانچہ تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دہرایا اور نیا پاکستان ایک بار پھر سیاسی بحرانوں کا شکار ہوا، اس سلسلے کی آخری کڑی جولائی ۱۹۹۳ء کا ڈرامہ ہے۔ جس میں مرکز اور صوبے ایک بار پھر سیاسی حریف کی حیثیت سے ایک دوسرے کے سامنے آئے۔ اور کروڑوں عوام اپنے مستقبل کے بارے میں قلق و اضطراب کا شکار ہوئے۔ مقام شکر ہے کہ ایک غیر سیاسی منظم قومی ادارے نے اس بحران پر قابو پانے کی راہ ہموار کی اور نئے انتخابات کے لیے نگران حکومت وجود میں آئی اور لوگوں

نے سکھ کا سانس لیا، لیکن اہل درد نے اس قلق کا اظہار بھی کیا کہ کیا جدید انتخابات ہمارے مسائل کا مداوا ہیں؟ بے شبہ، یہ قلق اور یہ اضطراب جائز اور فطری ہے، کیوں کہ انہیں ڈر ہے کہ ان انتخابات کی راہ سے پھر وہی لوگ اقتدار میں آئیں گے، جو ادھر کئی سال سے تخت سلطانی پر بیٹھے ہوئے دادِ عیش دے رہے ہیں اور جنہوں نے اپنے اقتدار کو ذاتی مفاد کا زینہ بنائے رکھا ہے۔ انہیں کبھی بھی بہ وجوہ قوم کے مسائل اور اس کی مشکلات سے کوئی سروکار نہیں رہا۔

قومی مسائل سے ارباب اقتدار کی غفلت و بے رخی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قومی دولت پر برابر سالہاسال سے یورش ہوتی رہی، لیکن "منتخب حکومت" نے نہ صرف اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا، بلکہ اہل ہوس نے انہی کے زیر سایہ قومی دولت کو دونو ہاتھوں سے لوٹا، اس لوٹ مار میں بنکوں سے لیے گئے بھاری قرضے اور مال دار لوگوں کو دے گئے پلاٹ بھی شامل ہیں، کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۲ء تک پاکستانی حکومت نے ترقیاتی منصوبوں کے لیے جو بیرونی امداد وصول کی تھی اس کا چوراسی (۸۴) فی صد حصہ سرکاری رپورٹوں کے مطابق ۲۲ خاندانوں میں چلا گیا۔ چنانچہ یہ برابر کہا گیا، کہ پاکستان میں دو قومیں پہلو بہ پہلو زندگی بسر کر رہی ہیں، ایک طرف خانماں برباد کروڑوں عوام ہیں، جن کے دکھ درد نے اقبال اور جناح کی ساری توانائیاں جذب کر کے پاکستان کو جنم دیا تھا۔ دوسری طرف چند "خاندان" ہیں جو عوام کے نام پر مسند اقتدار پر براجمان ہیں۔ لیکن عوام سے دور، چنانچہ زندگی کے ان تلخ حقائق کی بنا پر بجا طور پر کہا گیا کہ جو لوگ انتخابات کی موجودہ شکل کو اپنے مسائل کا حل تصور کرتے ہیں، وہ تمناؤں میں الجھائے گئے ہیں۔ کیوں کہ یہ انتخابات ہی ہیں جنہوں نے اب تک ان لوگوں کے سروں پر "خواجگی" کا تاج رکھا ہے۔ جنہیں خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے، عوام اور اہل درد اسی کشمکش میں تھے کہ نگران حکومت نے آئندہ آنے والے انتخابات کو موثر اور بامقصد بنانے کے لیے اعلان کیا کہ جن

لوگوں کا دامن مندرجہ بالا خرابیوں سے داغ دار ہے وہ انتخابات میں حصہ نہیں لے سکیں گے، ایسے ہی حکومت نے بیمار معیشت کو سہارا دینے کے لیے دوسرے جرات مندانہ فیصلے کیے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ غیر سیاسی نگران حکومت قومی اسمبلی میں ایسے لوگوں کو لانا چاہتی ہے، جن کا دامن بدعنوانی کے ہر دھبے سے صاف ہو، واقعہ یہ ہے کہ ان اقدامات پر بہت سے لوگوں کو خوش گوار حیرت ہوئی ہے۔ مقام حیرت ہے کہ جو کام بہت پہلے "منتخب حکومت" کو کرنا چاہیے تھا، اسے ایک غیر سیاسی حکومت سرانجام دے رہی ہے، عرفی نے سچ کہا ہے۔ :۔

سر خدا کہ عارف و زاہد بہ کس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

جہاں حکومت اپنے طور پر اصلاح احوال کے لیے بڑی ہمت، پامردی اور اخلاص سے کام کر رہی ہے، وہاں موجودہ نازک حالات نے عوام الناس کے کندھوں پر بھی بھاری ذمہ داریاں ڈال دی ہیں۔ عوام کا اخلاقی، جمہوری اور مذہبی فرض ہے کہ وہ ملک و قوم کو درپیش سنگین مسائل کا شدت سے احساس کریں اور ان لوگوں کو اپنا ووٹ دیں جو صحیح معنی میں نہ صرف قومی و ملی مشکلات سے آگاہ ہیں بلکہ اپنے مذہب، تاریخ اور روایات کا گہرا شعور بھی رکھتے ہیں اور پوری قوم کو حالیہ مادی اور معنوی زبوں حالی سے نکالنے کا درد رکھتے ہیں۔ آج ہم تاریخ کے جس موڑ پر کھڑے ہیں اگر ہم نے ووٹ کا صحیح استعمال نہ کیا، تو پھر ہمیں وقت کے خلاف زبان پر حرف شکایت لانے کا کوئی حق نہ ہو گا، واقعہ یہ ہے کہ ووٹ ایک مقدس امانت ہے اور اس امانت میں خیانت کرنے کا شرعی طور پر کسی کو حق حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ کسی نالائق یا بدعنوان امیدوار کو ووٹ دینے کا معنی یہ ہے کہ ہم نے جان بوجھ کر امانت میں خیانت کی ہے اور ملک و قوم کے مستقبل سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ، "(مسلمانو) خدا تمہیں حکم دیتا ہے، کہ جو جس کی امانت ہے،

وہ اس کے حوالے کر دیا کرو، (ایسا نہ ہو کہ کسی حق دار اور اہل کے حق سے انکار کرو) جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، تو چاہیے کہ انصاف کے ساتھ کرو۔" (النساء ۵۸)

یہ آیت کریمہ دین و شرع کے بنیادی احکام سے تعلق رکھتی ہے، جس نے معاشرے کے ہر گروہ کو اس امر کا پابند بنایا ہے کہ امانت کو اس کے اہل تک پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ جہاں ارباب حکومت کا فرض ہے کہ وہ معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام، ظلم و ستم کے خاتمے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے کام کریں، وہاں عام لوگوں کا بھی فرض ہے کہ وہ حقوق الناس کو ادا کریں۔ چنانچہ امانت کو واپس کرنا، یا عدالت میں سچی گواہی دینا یہ سب باتیں حق کو حق دار تک پہنچانے کے حکم میں آتی ہیں، جس طرح لوگوں پر اپنے بھائیوں کے حقوق پورے کرنا فرض ہے، اسی طرح اللہ کا ذکر اور اس کی عبادت کرنا بھی اللہ کی امانت ہے، جس کا ادا کرنا انسان کے ذمہ واجب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حق پرستی اور انسان دوستی کو اختیار کر کے ہی ہم صحیح معنوں میں ادائے امانت کے فریضہ سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔

رشید احمد (جالندھری)